حیاتِ مبارکہ کا آخری دن...... یومِ رحلت

یہ پیر کا دن تھا۔ [1] ربیع الاوّل کی ۱۲ تاریخ۔ حیاتِ مبارکہ کا آخری یوم۔ [2]

فجر کی اذان کے وقت حضور ﷺ کی طبیعت بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ جب جماعت کھڑی ہوئی تو آپ ﷺ نے حجرے کا پردہ اُٹھایا۔ عمر بھر کی محنت کا حاصل آپ کے سامنے تھا۔ صحابہ کرام صف بستہ، ہاتھ باندھے بارگاہِ الٰہی میں باادب کھڑے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ منظر اتنا دلکش تھا کہ چہرۂ انور خوشی سے تمتمانے لگا۔ آپ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہونے پر خوش تھے کہ اسلام کی وارث ایک اُمت تیار ہو چکی ہے جو تا قیامت اللہ کا پیغام عام کرنے اور بندوں کو بندگی سکھانے کے لیے مستعد ہے۔ آپ ﷺ ایک ایسی جماعت چھوڑے جا رہے تھے جو ہر حال میں دعوتِ اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح کمر بستہ تھی۔

---

(1) صحیح البخاری، ح: ۱۳۸۷، کتاب الجنائز، باب موت یوم الاثنین

(2) وفات کے بارے میں مشہور قول بارہ ربیع الاوّل کا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: "ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین، الثانی عشر من ربیع الاول، وفیہ بعث، وفیہ عرج بہ الی السماء، وفیہ ھاجر ومات." (البدایۃ والنہایۃ: ۳/۳۷۵) اگرچہ ابن کثیرؒ نے اس کی سند کو منقطع کہا ہے مگر اس کے الفاظ ''فیہ ھاجر ومات'' کو دیکھتے ہوئے جمہور سیرت نگاروں نے بارہ ربیع الاوّل ہی کو یوم وفات مانا ہے۔

اس قول پر ایک نہایت مشہور اشکال ہے، وہ یہ کہ صحیح روایات کے مطابق وفات کا دن پیر تھا۔ اور اس سے قبل یوم عرفہ (۹ ذوالحجہ) صحیح روایات کے مطابق بروز جمعہ ادا ہوا تھا۔ پس تقویمی حساب کے اعتبار سے بارہ ربیع الاوّل کسی بھی طرح نہیں ہو سکتی۔ اگر ذوالحجہ، محرم اور صفر کو تیس تیس دن کا مانا جائے تو ربیع الاوّل میں پہلا پیر ''۶'' کو اور دوسرا ''۱۳'' تاریخ کو ہوگا۔ اگر تینوں مہینوں کو ۲۹، ۲۹ دن کا تصور کیا جائے تو ربیع الاوّل کا پہلا پیر ''۲'' کو، دوسرا ''۹'' کو اور تیسرا ''۱۶'' کو ہوگا۔ اگر دو مہینے تیس اور ایک ۲۹ کا مانا جائے تو پہلا پیر ''۷'' اور دوسرا ''۱۴'' کو ہوگا۔ اگر دو مہینے ۲۹ کے اور ایک تیس کا سمجھا جائے تو پہلا پیر یکم کو، دوسرا ''۸'' اور تیسرا ''۱۵'' کو ماننا پڑے گا۔ غرض کسی بھی لحاظ سے پیر کو ۱۲ تاریخ نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے دو ربیع الاوّل کو راجح قرار دیا ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری مرحوم نے ۱۳ ربیع الاوّل کو تاریخ وفات قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے تاریخ ولادت (۹ ربیع الاوّل) کی مناسبت سے تاریخ وفات کے بارے میں بھی ۹ کو بہتر سمجھا ہے۔ مگر چونکہ "۱۳" یا "۹" کا امکان تبھی ہے جب ذوالحجہ، محرم اور صفر تینوں مہینے ۳۰ کے یا تینوں ۲۹ کے ہوں اور ایسا کم ہوتا ہے، اس لیے بعض حضرات نے ۸ ربیع الاوّل کے قول کو لے لیا ہے۔

بہر حال یہ سارے عقلی امکانات ہیں۔ ۱۲ ربیع الاوّل کے قولِ جمہور کے خلاف یہ عقلی امکانات اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جب مذکورہ اشکال کا کوئی جواب نہ ملے۔ حالانکہ اس کا ایک قوی جواب موجود ہے جسے حافظ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"وقد حصل لہ جواب صحیح فی غایۃ الصحۃ وللہ الحمد، افردتہ مع غیرہ من الاجوبۃ. وھو ان ھذا انما وقع بحسب اختلاف رؤیۃ ھلال ذی الحجۃ فی مکۃ والمدینۃ فرآہ اھل مکۃ قبل اؤلئک بیوم، وعلیٰ ھذا یتم القول المشہور."

"الحمد للہ! اس کا ایک صحیح جواب موجود ہے جو نہایت صحیح ہے، دیگر جوابات کے ساتھ اسے ذکر کرنے میں میں منفرد ہوں۔ وہ یہ کہ یہ مسئلہ مکہ اور مدینہ میں ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے اختلاف سے پیدا ہوا۔ اہل مکہ نے اہلِ مدینہ سے ایک دن پہلے چاند دیکھ لیا۔ اس بنیاد پر قولِ مشہور ثابت ہو جاتا ہے۔" (الفصول فی السیرۃ، ص ۲۲۰)

حافظ ابن کثیر کی اس توجیہ پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہو رہا، اس لیے یوم وفات بارہ ربیع الاوّل ہی راجح لگتا ہے جو مدنی چاند کے مطابق ہے۔

زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح مدینہ میں چار ماہ مسلسل ۳۰ دن کے ہوئے تھے مگر یہ ناممکن نہیں۔ رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے کے مطابق ذوالقعدہ، ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ اور محرم، صفر ۱۴۰۹ھ کے چار چاند مسلسل تیس دن کے ہوئے تھے۔ اس کے سات سال بعد ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ اور پھر محرم، صفر اور ربیع الاوّل ۱۴۱۶ھ کے چار چاند مسلسل تیس دن کے ہوئے۔ پس تیس دن کے چار چاندوں کا وقوع نادر تو ہے ناممکن نہیں۔

صحابہ کو احساس ہو گیا کہ حضور ﷺ پردہ اُٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہیں۔ آپ ﷺ دو دن سے مسجد میں تشریف نہیں لائے تھے۔ سوائے ان اکابر صحابہ کے جو روزانہ گھر میں حاضر ہوا کرتے تھے، اکثر جانثاروں نے دو دن سے آپ ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی۔ آپ ﷺ کو متوجہ پا کر سب کے رگ و پے میں سرور کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ پلٹ کر آپ کی زیارت کے لیے بے تاب ہونے لگے مگر آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں نماز مکمل کرنے کا حکم دیا اور چند لمحوں تک اپنے پروانوں پر الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد حجرہ شریفہ کا پردہ گرا لیا۔ ①

صبح سویرے حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی حالت بہتر دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی، باہر نکلے تو صحابہ کرام آپ ﷺ کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔

ان کے دریافت کرنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''الحمد للہ! حضور ﷺ اب ٹھیک ہیں۔''

صحابہ کرام مطمئن ہو کر اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ②

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کچھ دیر کے لئے آپ ﷺ سے اجازت لے کر مدینہ کے مضافاتی گاؤں ''سُنح'' میں اپنی دوسری اہلیہ کے گھر تشریف لے گئے۔ ③ پیچھے رسول اللہ ﷺ کی طبیعت پھر ناساز ہو گئی۔ بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ سہ پہر کے وقت پورے مدینہ منورہ پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ رحمت دو عالم ﷺ پر غشی کی حالت طاری تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک گود میں رکھ کر آپ کو سہارا دیا ہوا تھا، آس پاس اس وقت صرف اہل خانہ ہی تھے، اس دوران پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ

(ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا: انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا تو سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ سے دنیا میں رہنے یا آخرت کا سفر اختیار کرنے کی بابت پوچھا جا رہا ہے اور آپ ﷺ نے رحلت کو پسند کر لیا ہے۔ ④

آخری وصیت: نماز کا اہتمام اور کمزوروں پر رحم:

اب جان کنی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ آخری لمحات میں رسول اللہ ﷺ آہستہ آہستہ یہ فرما رہے تھے:

''اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ''

''نماز کا اہتمام کرنا۔ ماتحتوں اور کمزوروں کا خیال رکھنا۔''

آپ ﷺ یہ الفاظ دہراتے رہے، یہاں تک کہ آواز پست ہوتی چلی گئی۔ صرف ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے۔ ⑤

---

① صحیح البخاری، ح:۴۴۴۸، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاته
② صحیح البخاری، ح:۴۴۴۷ ؛ السیرة الحلبیة: ۳/۴۸۵ ③ السیرة الحلبیة: ۳/۴۹۵ ؛ صحیح البخاری، ح:۴۴۵۲
④ صحیح البخاری، ح:۴۵۸۶، کتاب التفسیر. صحیح مسلم، ح:۶۳۴۸
⑤ السیرة النبویة لابن کثیر: ۴/۴۷۳ ؛ دلائل النبوة للبیہقی: ۷/۲۰۵

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دم کرنے لگیں۔ اس دوران حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا: ”فِي الرَّفِيقِ الاَعْلٰى، فِي الرَّفِيقِ الاَعْلٰى“
(سب سے عالی شان رفیق کے پاس، سب سے عالی شان رفیق کے پاس)

اتنے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پیلو کی تازہ شاخ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ادھر جم گئی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب سمجھ گئیں۔ بھائی سے شاخ لے کر اسے صاف اور نرم کیا اور مسواک تیار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معمول کے مطابق اچھی طرح مسواک فرمائی مگر جب واپس فرمانے لگے تو مسواک آپ کے ہاتھ سے گر گئی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سہارا لے کر نیم دراز تھے۔ آپ کے سامنے پانی کا پیالہ رکھا تھا، آپ لیٹے لیٹے بار بار اس میں ہاتھ بھگو کر چہرۂ انور پر پھیرتے اور فرماتے:

”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه . اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَات . اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى سَكَرَاتِ الْمَوْتِ“

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک موت کی سختی برحق ہے۔ اے اللہ! موت کی سختی میں میری مدد فرما۔“[2]

اپنے والد ماجد کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بے ساختہ سسک اٹھیں:

”وَاكَرْبَ اَبَاهُ“ (ہائے! میرے ابا کی تکلیف۔)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لاڈلی بیٹی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے فرمایا:

”بیٹی! آج کے بعد تیرے ابا کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“[3]

اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک لمحے کے لیے غشی طاری ہوئی، دستِ مبارک پانی کے پیالے میں ایک طرف ڈھلک گیا پھر ہوش آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت کدے کی چھت کی طرف نگاہ اٹھائی، ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

”اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الاَعْلٰى“ (اے اللہ! اے سب سے عالی مرتبت رفیق!)

پھر ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے رہے:

”فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰى، فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰى“

یہ کہتے کہتے دستِ مبارک ایک طرف ڈھلک گیا۔ روحِ مبارک عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔[4]

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

عمر مبارک مشہور قول کے مطابق ۶۳ سال تھی۔[5] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ۶۵ سال کا قول بھی منقول ہے۔[6]

---

(1) السيرة النبوية لابن كثير: ۴/۴۷۴، ۴۷۵ (2) سنن الترمذی، ح: ۹۷۸
(3) صحيح البخاری، ح: ۴۴۶۲، كتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاته (4) صحيح البخاری، ح: ۴۴۴۹
(5) صحيح مسلم، ح: ۶۲۲۳، كتاب الفضائل۔ یہ ملکی تقویم کے مطابق ہے۔ ولادت ۸ ربیع الاول اور وفات ۱۲ کو مانی جائے تو ۶۳ سال چار دن ہوں گے۔
(6) صحيح مسلم، ح: ۶۲۴۸، كتاب الفضائل، خالص قمری تقویم کے مطابق عمر مبارک ۶۵ برس بنتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صدمے سے بے حال:

حضور ﷺ پر نزع کا عالم دیکھ کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد محترم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلوا لیا تھا مگر اُن کے پہنچنے سے پہلے حضور ﷺ دارِ فانی سے پردہ فرما چکے تھے۔ (1)

حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کی اطلاع سن کر صحابہ کرام پر بجلی گر پڑی۔ کسی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جب سے یہ دنیا بنی تھی کسی نے کسی سے ایسی محبت نہیں کی تھی، جیسی صحابہ کرام نے اپنے آقا و مولا سے۔ وہ یہ فراق کیسے برداشت کر پاتے۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر شدتِ غم سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدینہ منورہ پر تاریکی کے پرت لپیٹ دیے گئے ہوں۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ (2)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار فرما رہی تھیں:

”یَا اَبَتَاہ! اَجَابَ رَبًّا دَعَاہُ. یَا اَبَتَاہُ! مَنْ جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاہُ. یَا اَبَتَاہُ! اِلٰی جِبْرِئِیْلَ نَنْعَاہُ.“

”ہائے میرے ابا جی! آپ نے داعی اجل کی پکار پر لبیک کہہ دیا۔ ہائے میرے ابا جن کا مسکن جنت الفردوس ہے۔ ہائے ابا جی! ہم جبرئیل کو آپ کی وفات کا دکھڑا سناتے ہیں۔“ (3)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ جیسے گویائی وسماعت سلب ہوگئی ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے۔ (4) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحے پر حواس کھو بیٹھے اور ماننے سے انکار کر دیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رحلت ہوگئی ہے۔ منافقین کو اس سانحے پر خوش ہوتا اور سر اُٹھاتا دیکھ کر ان پر حالتِ غضب طاری تھی۔ (5)

اِس کٹھن وقت میں حضورِ اکرم ﷺ کے رازدار اور رفیق خاص سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خود پر قابو پائے ہوئے تھے۔ آقائے نامدار ﷺ کی وفات کی خبر سنتے ہی وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ”سُنح“ سے مدینہ پہنچے، حجرے میں داخل ہوئے۔ جسدِ اقدس چادر سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ انہوں نے چادر کھول کر پیشانی مبارک پر بوسہ دیا اور روتے ہوئے فرمایا: ”میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کی زندگی بھی بہترین تھی اور وفات بھی بہترین۔“ (6)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اب مسجد میں آئے، دیکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے درمیان کھڑے نہایت جوش سے کہہ رہے ہیں: ”کچھ منافق قسم کے آدمی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اللہ کی قسم! وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب سے ملنے گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے۔ بہت جلد وہ لوٹ آئیں گے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیں گے جو حضور ﷺ کی وفات کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔“ (7)

---

(1) السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۴۹۹، ط العلمیۃ. اس دن عیسوی تاریخ ۹ جون ۶۳۲ء تھی۔ (2) مسند احمد، ح: ۱۲۲۳۴

(3) صحیح البخاری، ح: ۴۴۶۲، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ

(4) طبقات ابن سعد: ۲/۳۱۲، ط دار صادر ؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۵۰۰، ط العلمیۃ

(5) مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۲۱ باسناد صحیح

(6) صحیح البخاری، ح: ۴۴۵۲، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ ؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۲۱ باسناد صحیح

(7) صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۷، ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب لو کنت متخذا خلیلا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تاریخ ساز خطبہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاموش کرایا اور صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''لوگو! جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو جان لے کہ وہ وفات پا گئے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ تسلی رکھے کہ اللہ زندہ ہے، ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔'' پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئاً وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشَّاكِرِيْن

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں) ان سے پہلے بھی تو کتنے رسول دنیا سے جا چکے ہیں، پس اگر وہ فوت ہو جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم دین سے منحرف ہو جاؤ گے؟ اور جو انحراف کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔''

یہ آیات غزوۂ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی جھوٹی افواہ پھیل جانے پر صحابہ کرام کی تسلی کے لیے نازل ہوئی تھیں مگر آج جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دہرایا تو صحابہ کرام کو ایسا لگا کہ ان کا اس سے زیادہ موزوں موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کہ یہ آیات ابھی آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوں جوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حقیقت پسندانہ خطاب سنتے گئے، اُن کا جوش، غم واندوہ میں تبدیل ہوتا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا یقین ہوتے ہی اُن کے قدم ساتھ نہ دے سکے، وہ اپنی جگہ پر گر گئے۔ [1]

☆☆☆

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۴۵۴

اُمت کی قیادت سنبھالنے کا سوال

اس وقت ہر شخص بے حد غم زدہ اور مضطرب ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں پر دستک دے رہا تھا کہ اب اُمت کی کشتی کا ملاح کون ہوگا؟ پیش آمدہ معاملات کس سے پوچھ کر طے کیے جائیں گے؟ مسائل کے حل کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ دینی وشرعی امور میں مسلمان کس سے رہنمائی لیا کریں گے؟ صحابہ منصب و اقتدار کے حریص نہ تھے مگر یہ سوال ضرور ذہنوں میں اُبھر رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا نائب کون ہوگا؟

رسول اللہ ﷺ کے آخری لمحات تک حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے خاندانی قرب کی وجہ سے کسی حد تک گمان تھا کہ آپ ﷺ شاید ان کے لیے حکومت کی وصیت فرمائیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید پیغمبر ﷺ کی جانشینی میں نسبی قرابت کی اہمیت بھی ملحوظ ہو۔ یہ دونوں حضرات پوری نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر خلیفہ اہلِ بیت میں سے ہوا تو مسلمانوں کا اتفاق واتحاد زیادہ پائیدار ہوگا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبیٔ اکرم ﷺ کی وفات سے کچھ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ سے جا کر پوچھ لیں کہ خلافت کس کے لیے طے ہوگی، ہم اہلِ بیت کے لیے یا دوسروں کے لیے؟ اگر ہمارے لیے طے ہو تو ہمیں اطمینان ہو جائے گا، اور اگر آپ ﷺ اسے دوسروں کے لیے طے کرنا چاہتے ہوں تو ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ یہ ذمہ داری ہمیں سونپ کر جائیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کچھ پوچھنے سے معذرت کر لی اور فرمایا: ”اگر ہم حضور اکرم ﷺ سے اس بارے میں پوچھیں اور آپ ﷺ منع فرما دیں تو بعد میں لوگ ہمیں کبھی بھی اقتدار نہیں دیں گے۔ اس لیے اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔“[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ حضور ﷺ اپنے گھر والوں کو قربانیوں میں آگے اور مناصب میں پیچھے رکھنے کے عادی تھے، لہٰذا ڈر تھا کہ خود قیادت مانگنے پر آپ ﷺ خفا نہ ہو جائیں۔ یہی اندیشہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تھا، ورنہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے۔ اگر انہیں کوئی خدشہ نہ ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہنے کی بجائے وہ خود رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کر سکتے تھے۔ دراصل اہلِ بیت کو اقتدار ملنا محض ان حضرات کا طبعی میلان اور ایک وقتی رائے تھی جسے وہ مناسب اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے اہم سمجھ رہے تھے، مگر جب رسول اللہ ﷺ ایسی کوئی وصیت کیے بغیر چلے گئے تو ان عاشقانِ رسالت نے بھی رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اُمت کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ مسلمانوں کو سیاسی قیادت کا آزادانہ فیصلہ خود کرنے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت کے دعوے کے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔

---

[1] صحیح البخاری، ح ۴۴۴۷، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاتہ

ہاں! انصار اس معاملے میں پہل کرنے لگے تھے، اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان سے ایک لغزش ہونے لگی تھی۔

پیر کی شام: سقیفۂ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟

اس وقت اسلام کا سیاسی و مذہبی مرکز مدینہ منورہ تھا جس کے مسلمان دو حصوں میں تقسیم تھے،: مہاجرین اور انصار۔ مہاجر کم تھے اور انصار زیادہ۔ پھر انصار میں دو قبیلے تھے،: اَوس اور خزرج۔ اَوس کم تھے اور خزرج زیادہ۔ خزرج کے لوگ اس وقت کسی خاص منصوبے کے یا پیش بندی کے بغیر اپنے سردار سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس بنے چبوترے پر جمع تھے۔ اسے ''سقیفۂ بنی ساعدۃ'' کہا جاتا تھا، یہاں جمع ہونا خزرج والوں کا معمول تھا۔ اس دوران اگر اُن کے ذہنوں میں یہ بات آرہی تھی کہ مسلمانوں کا اگلا قائد خزرج سے ہو تو یہ ایک فطری بات تھی؛ کیوں کہ ماضی میں عربوں کے ہاں اقتدار کا انحصار افرادی قوت پر ہوتا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ مدینہ میں خزرج کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ چنانچہ یہ خیال ذہنوں سے زبانوں پر منتقل ہو گیا اور بعض لوگ کہنے لگے: ''اب خزرج کے سردار سعد بن عُبادہ کو امیر بننا چاہیے۔''

ایک انصاری نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا: ''اور اگر مہاجرین نے اس سے اتفاق نہ کیا تو ہم کہیں گے: ایک ہمارا امیر ہونا چاہیے اور ایک تمہارا۔'' یہ ایک ایسا خیال تھا جو اُمت کی وحدت کو فوری طور پر دو حصوں میں بانٹ سکتا تھا، اسی لیے خود خزرج کے سردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس سے تو عدم استحکام کی ابتدا ہوگی۔''[1]

سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہونے والی اس گفتگو کی اطلاع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملی جو ابھی تک مسجد نبوی میں تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر افتراق کے اس شگاف کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو اُمّت کی تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ ان کے سامنے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی تھے جن میں حکومت وسیادت کی ذمہ داری قریش پر ڈالی جانے کے واضح اشارات تھے اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ انتقالِ اقتدار کے متعلق لوگوں کے شبہات کو فوراً دور کر کے انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبیلے کے کسی بہتر شخص کو امیر چن لیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر تیزی سے ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' پہنچے۔

وہاں پہلے انصار کے ایک نمائندے نے اپنی تقریر میں انصار کے فضائل اور کارنامے بیان کیے۔ اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اپنے ذہن میں ایک تقریر تیار کر لی تھی مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بولنے سے منع کر دیا اور خود موقع کی مناسبت سے نہایت موزوں گفتگو فرمائی۔[2]

یہ ایک کھلی مشاورت تھی جس میں صحابہ کرام پوری وسعت ظرفی سے ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے اور اپنے خیالات کو کسی روک ٹوک اور دباؤ کا سامنا کیے بغیر ظاہر کر رہے تھے، سب کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کی مرکزیت متاثر نہ ہونے پائے اور ایک مستحکم سیاسی نظام تشکیل پائے۔ اس مجلس مشاورت

[1] تاریخ الطبری: ۴۵۵/۲

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلاً

کو جو حضور ﷺ کے بعد پہلی بڑی مشاورت تھی، مسلمانوں میں شورائیت کا اہم سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں قریش کی قیادت کو ضروری سمجھتے تھے۔ جبکہ انصار میں سے کسی کو امیر بنانے پر خود انصار بھی متفق نہ ہوتے۔ اَوس والوں کو امیر بنایا جاتا تو خزرج والے ناراض ہوتے، خزرج والوں کو بنایا جاتا تو اَوس والے مطمئن نہ ہوتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کی ابتداء سے بات شروع کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ نے محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث کیا، پس اللہ نے ہمارے دلوں اور پیشانیوں کو تھام کر ہمیں ان کی دعوت قبول کرنے کی سعادت بخشی۔''[1]

آپ نے انصار کی قومی و دینی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا اور فرمایا:

''آپ ان تمام فضائل کے بجا طور پر حق دار ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار کے فضائل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہ چھوڑی اور ان سے حضورِ اکرم ﷺ کے دلی تعلق کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ارشادِ نبوی دہرایا:

''اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کی راہ پر چلوں گا۔''[3]

لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو یہ بھی یاد دلایا کہ اس وقت قیادت قریش کو سونپنے میں خیر ہے۔ آپ نے فرمایا:

''ہم مہاجرین لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں، ہم رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں۔[4] اللہ کی قسم! ہم آپ لوگوں کی فضیلت، اسلام کے لیے آپ حضرات کے کارناموں اور اپنے اوپر عائد آپ کے حقوق کا انکار نہیں کرتے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ قریش کا قبیلہ عرب میں ایسی قدر و منزلت کا حامل ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں۔ عرب قبائل قریشی آدمی کے سوا کسی شخص پر متفق نہیں ہوں گے۔ آپ اللہ سے ڈریں اور اسلام کو پارہ پارہ نہ کریں، اسلام میں سب سے پہلے رخنہ ڈالنے والے نہ بنیں۔''[5]

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''امراء ہمارے ہوں اور وزراء آپ کے۔''[6]

مگر ایک انصاری سردار حُباب بن مُنذِر رضی اللہ عنہ بولے: ''یوں کر لیا جائے کہ ایک امیر ہمارا ہو۔ ایک تمہارا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! وزارت تمہاری قیادت ہماری؛ کیوں کہ قریش سب سے معزز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور حسب و نسب میں بھی سب سے اعلیٰ ہیں۔''[7]

---

① السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۱۹۲۳، ط دار الکتب العلمیة

② مسند احمد، ح: ۳۹۱

③ مسند احمد، ح: ۱۸

④ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۱۹۲۳

⑤ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۰۴۳، ط الرشد

⑥ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلاً

⑦ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلاً

دراصل دو حکمرانوں کی تجویز پر عمل کرنا اسلامی ریاست کو ابتداء ہی سے سبوتاژ کرنے کے مترادف تھا؛ کیوں کہ یہ فطرتی بات ہے کہ ایک سلطنت میں دو بادشاہ اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ نیز عرب کے لوگ بھی اس بات کو قبول نہیں کرسکتے تھے کہ ان کا سردار پیغمبر ﷺ کے قبیلے کے سوا کسی اور قبیلے کا ہو۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک نیام میں دو تلواریں جمع نہیں ہوسکتیں۔''[1]

اس دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف پر دلیل پیش کرتے ہوئے حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے سعد! آپ جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے آپ کی موجودگی میں فرمایا تھا: قیادت کے ذمہ دار قریش ہیں، اچھے لوگ ان کے اچھوں کے پیچھے چلتے ہیں اور بُرے لوگ ان کے بُروں کی اتباع کرتے ہیں۔''

سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو حدیث یاد آگئی، وہ بلا پس و پیش بولے: ''آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم وزیر اور آپ امیر۔''[2]

تب انصار میں سے بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کو مخاطب کرکے ولولہ انگیز لہجے میں گویا ہوئے:

''اے انصار! بلاشبہ ہم مشرکین سے جہاد میں پیش پیش رہے مگر اس سے ہمارا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پانا اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا رہا ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اپنی دینی خدمات کے بدلے کسی منصب کے حصول کی کوشش کریں یا دنیا کے طلب گار بنیں، بلاشبہ محمد ﷺ قریش سے تھے اور اُن کا قبیلہ اُن کا جانشین بننے کا زیادہ حق دار ہے۔''[3]

ایک اور انصاری نے پکار کر کہا: ''بھائیو! حضور ﷺ مہاجرین میں سے تھے۔ ان کا نائب بھی مہاجرین میں سے ہونا چاہیے۔ ہم حضور ﷺ کے مددگار تھے۔ ان کے نائب کے بھی مددگار رہیں گے۔''[4]

انصار نے ان کی پکار پر لبیک کہا۔ انصار کے بخوشی دستبردار ہوجانے کے بعد خلافت کا مسئلہ حل کرنا اتنا کٹھن نہیں رہا تھا۔ دو باتوں پر سب کا اتفاق ہوگیا تھا: ایک یہ کہ امیر ایک ہی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس کا تقرر قریش ہی سے ہوگا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ اب اگلے مسئلے یعنی امیر کے چناؤ کو بھی اس مجلس میں طے کرلیا جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''تو بہتر ہے کہ تم لوگ عمر یا ابو عبیدہ کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔''[5]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی شان اس سے ظاہر تھی کہ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔''[6]

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۵۸، ط المجلس العلمی پاکستان

② مسند احمد، ح: ۱۸ ③ تاریخ الطبری: ۲۲۱/۳

④ البدایۃ والنہایۃ: ۹۰/۸ ؛ تاریخ دِمَشق لابن عساکر: ۲۷۷/۳۰ عن بیہقی

⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸. دراصل اس وقت عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا یہی دو حضرات موقعے پر موجود تھے اس لیے ان کا نام لیا گیا۔ پس یہ مطلب نہ لیا جائے کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت حاصل تھی۔ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما باقی عشرہ مبشرہ سے افضل تھے جیسا کہ متعدد احادیث سے واضح ہے جو کتبِ حدیث میں ''مناقب'' اور ''فضائل'' کے عنوانات کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں۔

⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۶۸۶ ؛ مسند احمد، ح: ۱۷۴۰۵

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور اُن کی امانت اور قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے انہیں دربارِ نبوت سے ''امین الامت'' کا خطاب ملا تھا، مگر سب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہیں بڑھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خود بھی کہاں گوارا تھا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں بڑے بنیں۔ انہوں نے لوگوں کو پکار کر کہا: ''تم جانتے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو نماز کے لیے آگے کیا تھا اور انہوں نے سب کو نماز پڑھائی تھی۔'' سب نے کہا: ''ہاں بالکل''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو تم میں سے کون ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے؟''

سب نے کہا: ''اللہ معاف کرے۔ ہم میں سے کسی کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی:

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہم سب آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، آپ ہمارے بزرگ، بہترین انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے دوست ہیں۔''[2]

اِدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بازو پکڑ کر انہیں بیعت لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھانے پر آمادہ کیا، اُدھر بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ لپک کر آئے اور سب سے پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی اور وفاداری کا عہد کیا۔ ان کے بعد سب ہی ٹوٹ پڑے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس نمائندہ اجلاس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق ہوگیا۔[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت کیوں لی؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود حکومت کے طلب گار نہیں تھے مگر اس موقع پر انہیں خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ یہ ذمہ داری خود نہیں سنبھالیں گے تو لوگوں میں انتشار پھیل جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''وَتَخَوَّفْتُ اَنْ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ بَعْدَهَا رِدَّةٌ''

''مجھے خوف محسوس ہوا کہ کوئی ایسا فتنہ رونما نہ ہو جائے کہ لوگ بکھر جائیں۔''[4]

---

① الشریعة للامام الآجری، ح: ۱۱۹۸، ط دارالوطن ؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۵۵ ؛ مسند احمد، ح: ۱۳۳، اسنادہ حسن

② صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلاً

③ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۰۴۳، ط الرشد ؛ تاریخ الطبری: ۲۲۱/۳ ④ مسند احمد، ح: ۴۲ بسند صحیح

یاد رہے کہ مشاورت، بحث اور بیعت کی یہ مجلس (جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہوئی) آدھے پونے گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ مگر داستان طراز راویوں نے اس مجلس کے حوالے سے صحابہ کرام کی باہم تلخ کلامی اور حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کی بیعت سے روگردانی پر کئی صفحے سیاہ کیے ہیں۔ حالانکہ اس مختصر وقت میں اتنی لمبی چوڑی باتوں کا امکان ہی نہ تھا۔ ہم نے یہاں تاریخ کو چھوڑ کر مذکورہ روداد زیادہ تر کتبِ حدیث خصوصاً بخاری اور مسند احمد کی معتبر روایات کے حوالے سے لکھی ہے، صرف دو تین ٹکڑے تاریخِ طبری اور البدایہ والنہایہ سے لیے ہیں۔ بخاری کی روایت ''صحیح'' ہے اور مسند احمد کی ''صحیح مرسل'' ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا مشورہ کھلی بحث کے ساتھ اور فیصلہ خوش گوار ماحول میں ہوا تھا اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے اسی مجلس میں خلافت کا حق قریش کے لیے تسلیم کر لیا تھا۔ اسی لیے ابومخنف جیسے لوگوں کی تاریخی روایات ان مضبوط روایات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ایسی بے سروپا روایات سے متاثر ہو کر صحابہ کرام کے بارے میں بدگمان ہونا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضور ﷺ کا غسل اور تکفین:

اِس دوران خانۂ اقدس میں حضورِ اکرم ﷺ کے غسل اور تجہیز و تکفین کے اُمور انجام دینے کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔ پہلے دن تو رنج و صدمے اور دُکھ کی انتہا کی وجہ سے شمعِ رسالت کے پروانے ایک سکتے کی سی کیفیت میں تھے، اس لیے کسی میں اِن اُمور کی انجام دہی کی سکت ہی پیدا نہ ہوسکی۔ بھلا کون تھا جو اپنے محبوب آقا ﷺ کے جسدِ اطہر کو مٹی تلے دفن کرنے کی ہمت کرتا؟ کون تھا جو اپنے ہاتھوں سے اپنے جینے کی آس کو نظروں سے اوجھل کرتا؟ اعصاب شل ہو چکے تھے اور ذہنی قوتیں مفلوج لیکن تقریباً چوبیس گھنٹے بعد ہوش و حواس بحال ہوئے اور وہ شدید ترین کیفیت جاتی رہی تو حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ، داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور پھوپھی زاد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ غسل دینے اور کفن پہنانے کے اُمور میں مشغول ہوگئے۔ [1] یہ حضرات حضورِ اقدس ﷺ کے قریبی رشتے دار تھے، اسی لیے یہی آپ ﷺ کی آخری خدمات انجام دینے کے زیادہ حق دار تھے۔

نائبِ رسول کی باقاعدہ بیعت:

سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت انہی صحابہ نے کی تھی جو وہاں اتفاق سے پہلے جمع تھے، ان میں زیادہ تر انصاری تھے وہ بھی بنوخزرج کے۔ چونکہ وہاں اتفاقیہ طور پر خلافت کے استحقاق پر بات چل نکلی تھی اس لیے کسی کو مدعو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے بہت سے صحابہ کرام یہاں تک کہ حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ بھی اس موقع پر موجود نہ تھے۔ اہلِ شوریٰ کو باقاعدہ مدعو کرکے مشورہ نہیں ہوا تھا جیسا کہ اسلامی اصولِ سیاست کا تقاضا تھا۔ [1] چنانچہ اگلے دن، منگل کو صحابہ کے عام اجتماع میں حضورِ اکرم ﷺ کے نائب اور خلیفہ سے بیعت کا اہتمام کیا گیا۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر یہ ابتدائی کلمات ارشاد فرمائے:

---

① سیرت ابن ھشام: ۲/۶۶۲، ط مصطفیٰ البابی

② اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اضطراری طور پر ہونے والے ایک فیصلے اور شریعت کے مستقل سیاسی اصول کا فرق واضح کرتے ہوئے بعد میں فرمایا کرتے تھے: ”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ فلاں کہتا ہے کہ: اگر عمر کا انتقال ہوگیا تو میں فلاں سے بیعت کرلوں گا۔ کسی کو اس بات سے دھوکہ نہ ہو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی اچانک ہونے کے باوجود نافذ ہوگئی تھی۔ بلاشبہ وہ اسی طرح اچانک ہی ہوئی تھی مگر اللہ نے اس کے شر سے بچالیا۔ تم میں سے اب کون ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح نگاہوں کا محور ہو۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو وہ ہمارے بہترین آدمی تھے۔“ (صحیح ابن حبان، ح: ۴۱۳، ۴۱۴)
یہ بھی فرمایا: ”جو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کرے گا تو نہ اس کی پیروی کی جائے گی نہ بیعت کیے جانے والے کی، بلکہ دونوں کو قتل کردیا جائے گا۔“ (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۵۸، ط المجلس العلمی پاکستان)
دراصل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ابتدائی بیعت میں جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہوئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بہت بنیادی کردار تھا اور ان کی نگاہِ دوربین نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر بہت سے اکابر کی غیر حاضری کے باوجود اس معاملے کو ابھی یہیں طے نہ کرلیا گیا تو مسلمان روزِ اوّل ہی سے دو ٹکڑوں میں بٹ کر رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے طور پر فوراً یہ اجتہادی فیصلہ کرلیا کہ چند بڑے نمائندوں کی یہاں موجودگی سب کے قائم مقام ہے اور ان شاء اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق باقی سب کی رضا بھی حاصل ہوجائے گی۔ اور الحمدللہ! ایسا ہی ہوا۔ یہ اُمت کی خوش قسمتی اور اللہ کی مشیت تھی کہ حضراتِ شیخین کے وہاں پہنچنے تک انصار نے اپنے کسی سردار سے بیعت نہیں کرلی تھی ورنہ ایک بار بیعت کرکے وہ اسے توڑنے پر بمشکل آمادہ ہوتے؛ کیوں کہ اہلِ عرب کے ہاں زبانی قول کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اچانک بیعت کے باوجود اُمت کا ان پر اتفاق بلاشبہ ان کی اجماعی افضلیت، عنداللہ مقبولیت، اللہ کی مشیت، اور اس کی تکوینی تائید کی کھلی دلیل ہے۔

③ صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۹، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف؛ البدایة والنھایة: ۹/۴۱۶

''میں تو اُمید کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے حتیٰ کہ ہم سب کے بعد تشریف لے جائیں گے، بہرحال حضور ﷺ دنیا سے رخصت ہو چکے مگر اللہ نے ہمارے درمیان وہ نُور باقی رکھا ہے جس سے تم ہدایت لے سکتے ہو۔ یہ وہی نورِ ہدایت ہے جو اللہ نے اپنے نبی کو عنایت کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے معتمد صحابی ہیں۔ بتاؤ ''اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ'' سے کون دونوں مراد ہیں؟ ''اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِه'' کا مصداق اور کون ہے؟ ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' کن کے متعلق ہے؟ لوگو! یہ ثانی اثنین ہیں۔ یہ مسلمانوں کے امور انجام دینے کے لیے سب سے بہتر ہیں۔ پس آپ کھڑے ہوں اور ان سے بیعت کر لیں۔''[1]

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منبر پر بٹھایا اور لوگوں نے بیعت کی۔ بیعت کا طریقہ وہی تھا جو عربوں میں قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا یعنی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر وفاداری کا عہد کیا جاتا تھا۔

حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بیعت کرنے میں تاخیر کیوں کی؟

تین اہم افراد اس وقت بھی موجود نہ تھے: ایک خزرج کے سردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، تیسرے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ چونکہ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ گزشتہ روز خلافت پر قریش کے حق کو تسلیم کر چکے تھے، اس کے علاوہ وہ بیمار بھی تھے، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دوبارہ زحمت دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ مگر حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے نہ ہونے سے غلط فہمیاں جنم لے سکتی تھیں، اس لئے آپ رضی اللہ عنہ نے دونوں کے بارے میں خصوصی طور پر پوچھا۔ ان کی عدم موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ دونوں بیتِ نبوی میں تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اسی لیے حاضر نہ تھے۔[2]

مگر چونکہ منافق افواہ اڑا سکتے تھے کہ یہ حضرات بیعت سے متفق نہیں، لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی نہ صرف موجودگی ضروری سمجھی بلکہ جب وہ آئے، تو اپنے کسی شبہے کی بناء پر نہیں بلکہ ممکنہ افواہوں کے ازالے کے لیے سب کے سامنے ان سے پوچھا: ''کیا تم مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہو؟''

دونوں بولے: ''رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! ایسی کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر دونوں نے بیعت کی۔[3]

دونوں نے یہ بھی کہا: ''ہمیں قلق تو ہوا کہ انتخاب کے مشورے میں ہمیں شریک نہیں کیا گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ ہی سب سے افضل ہیں۔''[4]

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۹، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف ؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۱۱۱۵۵

② البدایة والنهایة: ۹/۴۱۶، ۴۱۷

③ السنة لعبد اللہ بن احمد، ح: ۱۲۹۲ ؛ مستدرک حاکم، ح: ۴۴۵۷ ؛ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۵۳۸ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ روایت امام مسلم کو دکھائی گئی تو انہوں نے اس کی توثیق کی۔ (السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۵۳۹) معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت میں چھ ماہ تاخیر کرنے کی روایت قابل تاویل ہے۔

④ البدایة والنهایة: ۹/۴۱۷. عن موسیٰ بن عقبة. قال الحافظ ابن کثیر اسناده جید ولله الحمد ...... چھ ماہ تک بیعت کو مؤخر کرنے کی اگر کوئی دلیل ہے تو وہ امام زہری کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک طویل روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات...... (بقیہ اگلے صفحے پر)

ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب بتایا گیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے تو وہ اتنی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا اور انہیں تنہا اپنے ہاں بلوا کر کہا: "ہم آپ کی فضیلت اور اللہ کے آپ کو بخشے ہوئے مقام سے واقف ہیں۔ ہم اس شرف کی حرص نہیں کرتے جو اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے۔ مگر آپ ہمارے مشورے کے بغیر حکمران بن گئے جبکہ ہمارا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کی وجہ سے ہمارا بھی مشورے میں حصہ ہوگا۔" یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آنسو بہ پڑے اور فرمایا: "بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت مجھے اپنے رشتے نباہنے سے زیادہ عزیز ہے۔" مزید کچھ گفتگو کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں آپ سے کل ملوں گا۔" جب (اگلے دن) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو حمد وثنا کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حال اور بیعت میں ان کی تاخیر کا سبب اور ان کا عذر بیان کیا اور ان کے لیے استغفار کی۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت بیان کی، پھر فرمایا: "مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حسد نے ایسا کرنے پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ان فضائل کا منکر ہوں جو اللہ نے انہیں مرحمت کیے ہیں۔ مگر ہمارا خیال تھا کہ ہمارا بھی مشورے میں حصہ ہوگا اور یہ اس کے بغیر ہمارے حاکم بن گئے ہیں۔ پس ہم دل میں خفا ہوئے۔" (صحیح البخاری، ح: ۴۲۴۰، باب غزوۃ خیبر ؛ صحیح مسلم، ح: ۴۶۷۹، کتاب الجہاد)

اسی روایت کو بعض محدثین نے اس اضافے کے ساتھ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی؟ انہوں نے کہا: "لا، ولا احد من بنی ھاشم حتیٰ بایعہ علیّ." (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۴؛ السنن الکبریٰ للبیھقی، ح: ۱۲۷۳۲)

علماء کی ایک جماعت ان روایات کو من وعن قبول کرتے ہوئے یہ رائے رکھتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ بعد بیعت کی تھی، مگر یہ حضرات واضح کرتے ہیں کہ اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام عائد ہوسکتا ہے نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کا انعقاد مشکوک ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت میں تاخیر کرنے کا مسئلہ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اسے مذکورہ روایت میں بیان کر دیا ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے عذر کو قبول کیا ہے۔ اور اس کے باوجود یہ تاخیر نہ بیعت کو متاثر کرتی ہے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ بیعت کے متعلق علماء کا اتفاق ہے کہ اس کی صحت کے لیے تمام لوگوں یا تمام اہلِ حل وعقد کا اجماع شرط نہیں۔ بلکہ علماء، امراء اور عوامی رہنماؤں میں سے جو میسر ہوں ان کا بیعت پر اجماع شرط ہے۔ یہ (بیعت میں تاخیر) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقام کو اس لیے متاثر نہیں کرتی کہ ہر شخص پر یہ واجب نہیں کہ وہ خلیفہ کے پاس جائے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بیعت کرے بلکہ واجب صرف یہ ہے کہ جب اہلِ حل وعقد کسی کی امامت پر متفق ہو جائیں تو اس کی اطاعت کی جائے۔ اختلاف نہ کیا جائے اور اجتماعیت کا ماحول نہ توڑا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پہلے یہی حالت تھی کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی اختلاف ظاہر کیا نہ اجتماعیت کو توڑا۔ ہاں ایک عذر کی وجہ سے بیعت کے لیے حاضری میں تاخیر کی جو اس روایت میں مذکور ہے۔ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی) بیعت کا قائم ہونا یا نہ ہونا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حاضری پر منحصر نہ تھا۔ جب یہ ضروری نہ تھا، تو وہ حاضر بھی نہ ہوئے۔ جو ان سے منقول ہے، وہ نہ بیعت کو متاثر کرتا ہے نہ اس کی مخالفت ظاہر کرتا ہے۔ ہاں لیکن ان کے دل میں ناراضی تھی اور جب تک وہ دور نہ ہوئی، انہوں نے حاضری کو ملتوی رکھا۔ اس ناراضی کا سبب یہ تھا کہ اپنی وجاہت، فضیلت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کے سبب وہ یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ان کے مشورے اور موجودگی ہی میں طے ہوگا۔ مگر حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا عذر واضح ہے؛ کیوں کہ انہوں نے فوری بیعت کو مسلمانوں کی سب سے اہم مصلحت سمجھا اور اس کی تاخیر میں انہیں اختلاف اور تنازعہ اٹھنے کا خوف ہوا جس سے بڑے فتنے رونما ہو سکتے تھے۔"

(شرح نووی: ۷۸/۱۲، دار احیاء التراث، و کذا قال العینی فی عمدۃ القاری: ۲۵۸/۱۷. ط دار احیاء التراث)

یہ تو ان حضرات کی رائے تھی جو چھ ماہ بعد بیعت کی روایات کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔ درحقیقت اس سے بھی جمہور مسلمین کے مسلک پر کوئی حرف نہیں آتا جیسا کہ امام نووی کے کلام سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف علماء کی ایک بڑی جماعت ان روایات کو محلِ نظر سمجھتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ چاہے یہ روایات صحیح ہوں مگر ضروری نہیں کہ صحیح السند روایت کسی بھی لحاظ سے موضوعِ بحث نہ بن سکے۔ خصوصاً جبکہ ان کے بالمقابل ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت موجود ہے۔ ان علماء میں امام بیہقی رحمہ اللہ سرفہرست ہیں جنہوں نے روایتِ زہری کو نقل کرنے کے بعد درجِ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"زہری کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے احتراز کرنے کا قول منقطع ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت جس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعتِ سقیفہ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عام بیعت کی تھی، اصح ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیھقی، ح: ۱۲۷۳۲)

ان علماء نے روایتِ زہری میں لفظ "چھ ماہ بعد" کو امام زہری کے وہم اور راوی کے ادراج پر محمول کیا ہے۔ (الاعتقاد، ص ۳۵۲، ط دار الآفاق)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ابن حبان اور دیگر علماء نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کی ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے جن کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شروع ہی میں بیعت کر لی تھی۔" اس کے بعد وہ ان علماء کی رائے ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے روایات کا تعارض دور کرنے کے لیے تطبیق کا طریقہ اختیار کیا، فرماتے ہیں:

"دیگر حضرات نے روایات کو یوں جمع کیا ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جو پہلی بیعت کی تاکید کے لیے تھی تاکہ میراث کی وجہ سے جو کچھ ہوا تھا، اس کا ازالہ ہو جائے جیسا کہ پیچھے گزر چکا۔ اس صورت میں زہری کا قول کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان ایام میں بیعت نہیں کی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تیزی سے گھر سے نکل کر آئے کہ چادر تک ساتھ نہ لی۔[1]

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پہلا خطاب:

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بحیثیت سربراہِ مملکت مسلمانوں سے پہلا خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! مجھے کبھی سرداری کی آرزو نہیں رہی۔ میں نے کبھی اللہ سے حکومت کی دعا نہیں مانگی۔ مگر میں فتنے پھیل جانے کے خوف سے یہ ذمہ داری اُٹھانے پر مجبور ہوا۔ مجھے اس عہدے میں کوئی آرام نہیں مل رہا۔ مجھے تو ایسی ذمہ داری کا طوق پہنا دیا گیا ہے کہ اللہ کی توفیق کے بغیر مجھ میں اس کی سکت نہیں ہے۔''[2]

پھر آپ نے فرمایا:

''لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے، اگرچہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مجھ سے تعاون کرنا، اگر برائی کروں تو میری اصلاح کر دینا۔ سچائی، امانت ہے اور جھوٹ، خیانت۔''

آپ نے حکومت کی بنیادی ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''قوم کا معمولی آدمی میرے نزدیک اُس وقت تک سب سے اہم ہے جب تک میں اسے اُس کا حق نہ دلوا دوں۔ قوم کا طاقتور فرد میرے نزدیک معمولی ہے، جب تک میں اُس سے مظلوم کا حق وصول نہ کرلوں۔''[3]

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)......ہم نشین اور حاضر باش نہ رہنے کے ارادے یا ایسی ہی کسی صورتحال پر محمول ہوگا۔ چونکہ ایسی ہستی کا ایسی شخصیت سے الگ رہنا، حقیقتِ حال کو نہ جاننے والوں کو اس شبہے میں ڈال سکتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر راضی نہیں اور کہنے والوں نے اس بات کو مشہور کردیا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد بیعت کو سرِ عام کیا تا کہ یہ شبہ دور ہو جائے۔'' (فتح الباری: ۷/ ۴۹۴، ۴۹۵، ط دار المعرفہ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ چھ ماہ بعد یہ عام مجمع میں تجدید بیعت تھی۔ اصل بیعت پہلے ہو چکی تھی۔ (البدایة والنهایة: ۸/ ۱۸۸)

چھ ماہ بعد بیعت کا ذکر بعض ضعیف روایات میں بھی ہے مثلاً ایک روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت میں تاخیر کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"انی آلیت بیمین حین قبض رسول اللہ ان لاارتدی برداء الا الی الصلوٰة المکتوبة حتیٰ اجمع القرآن فانی خشیت ان ینفلت القرآن."

''میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت قسم کھائی تھی کہ فرض نماز کے سوا اپنی چادر نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن مجید جمع نہ کرلوں؛ کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔'' (مصنف عبد الرزاق، ح: ۹۷۶۵، واخرجه ابن سعد فی الطبقات بلفظ: "آلیت بیمین ان لاارتدی بردائی الا الی الصلوٰة حتیٰ اجمع القرآن.": ۲/ ۲۵۸) یعنی انہوں نے بیعت کو چھ ماہ تک اس لیے مؤخر کیا کہ وہ اس دوران قرآن مجید کو جمع کرنے کے لیے گھر میں تھے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اہلیہ کی تیمارداری میں مشغولیت بھی ان کا عذر تھا جو چھ ماہ بیمار رہنے کے بعد رحلت فرما گئی تھیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ اعذار کسی شخص کو ایسا مشغول نہیں کرسکتے کہ وہ گھر میں بند ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان اعذار کے باوجود نماز کے لیے مسجدِ نبوی میں حاضر ہوتے تھے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی نماز کے بعد بیعت کرسکتے تھے جو ایک منٹ کا کام تھا۔ پس ایسی روایات کا صحیح محمل یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کے باوجود بیعت کے تحت لازم خدمات سے خود کو کچھ مدت تک مستثنیٰ کرائے رکھا تھا۔ اس سے جو شبہات پھیلے، انہیں دور کرنے کے لیے بعد میں تجدید بیعت کی۔

شیعہ اثنا عشریہ کی معتمد اور قدیم کتب سے بھی شہادت ملتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابتداء میں بیعت کر چکے تھے۔ امام محمد باقر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: فهل بایعته؟ ''کیا آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی ہے۔'' قال: نعم ''انہوں نے جواب دیا: جی ہاں'' (الاحتجاج للطبرسی: ۱/ ۱۳۱)

ظاہر ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ واپسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنتے ہی ہوگئی تھی۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کا اقرار ثابت کرتا ہے کہ قدیم شیعہ علماء کے نزدیک بھی اصل بیعت فی الفور ہو چکی تھی۔ پس چھ ماہ بعد بیعت کی روایت مرجوح اور قابلِ تاویل ہے۔

﴿حاشیہ صفحہ موجودہ﴾ ① تاریخ الطبری: ۳/ ۲۰۷

② المستدرک للحاکم، ح: ۴۴۲۲، باسناد صحیح ③ طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۸۲؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۵۹، ط مکتبة نزار

اس ارشاد میں یہ پیغام مضمر تھا کہ حکومت درحقیقت عام لوگوں اور کمزوروں کی دیکھ بھال کے لیے وجود میں آتی ہے ورنہ امراء و رؤساء کو تو اپنی وجاہت اور رعب داب کی وجہ سے گھر بیٹھے حقوق ملتے رہتے ہیں، حکومتی خدمات کی اصل ضرورت عوام کو ہے اس لیے اسلامی حکومت انہی کو ترجیح دے گی۔ اس ارشاد میں یہ تنبیہ بھی تھی کہ امراء کو دوسروں کا حق مارنے کی عادت بد سے دور رہنا چاہیے؛ کیوں کہ اسلامی حکومت محروم لوگوں کی حمایت کے لیے مستعد اور ان کی حامی ہے۔

آپ نے جہاد کی اہمیت اور گناہوں کی نحوست کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''یاد رکھو! جب کبھی کسی قوم نے جہاد ترک کیا تو اللہ نے اس پر ذلت و رسوائی ضرور مسلط کی ہے۔ جب بھی کسی قوم میں بدکاری بڑھتی ہے تو اللہ اسے ہمہ گیر آفات میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

آخر میں اسلامی حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ کے سپرد ہونے کا نظریہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

''جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تب تک میری پیروی کرنا۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری پیروی لازم نہیں۔''[1]

جب شمعِ رسالت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی:

حضورِ اقدس ﷺ کی تجہیز و تکفین ہو چکی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ جنازہ ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ''نمازِ جنازہ کیسے پڑھیں؟'' فرمایا: ''ٹولیاں بنا بنا کر اندر جاؤ، نماز پڑھتے رہو۔'' چنانچہ اس طرح نمازِ جنازہ ادا کی گئی، رسول اللہ ﷺ کا جنازہ حجرۂ عائشہ میں ہی رہا، تھوڑے تھوڑے لوگ حجرے کے اندر جاتے اور اپنی نماز پڑھ کر باہر نکل آتے۔ نمازِ جنازہ کی امامت کوئی نہیں کرتا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ ہی کی وصیت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے فرمایا تھا:

''پہلے میرے گھر والے میری نمازِ جنازہ ادا کریں۔ سب لوگ تنہا تنہا نمازِ جنازہ ادا کریں۔''[2]

اس حکم کے مطابق پہلے اہل بیت، پھر مردوں، پھر خواتین، پھر بچوں اور پھر غلاموں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔[3]

چونکہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، جبکہ حجرۂ عائشہ میں ایک وقت میں تھوڑے ہی افراد سما سکتے تھے۔ اس لیے نمازِ جنازہ کے عمل میں پورا دن گزر گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کہاں دفن کیا جائے؟ لوگوں نے الگ الگ تجاویز دیں اور اختلاف پیدا ہونے لگا۔ کسی نے کہا: حجرۂ شریفہ میں ہی دفن کیا جائے اور کسی نے کہا: عام مسلمانوں کے ساتھ۔ تب

---

① تاریخ الطبری: ۳/ ۲۴۰

② دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/ ۲۳۲ ③ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/ ۲۵۰

یاد رہے کہ حجرہ سے مراد کمرہ نہیں بلکہ گھر کا برآمدہ یا چھپر ہے، جو کمرے اور صحن کے درمیان ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ ایئرپورٹ روڈ پر ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبدالرحمن کے قائم کردہ جدید میوزیم میں اس دور کے مدنی تمدن کو امکانی حد تک تحقیق کے بعد ماڈلز کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ وہاں عہدِ رسالت کی مسجد نبوی اور امہات المؤمنین کے گھروں کے ماڈلز بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر حجرے کا صحیح مفہوم بھی سمجھ آ جاتا ہے۔ حجرۂ شریفہ کے دو دروازے تھے۔ ایک گلی میں اور دوسرا مسجد کے اندر کی جانب کھلتا تھا، اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ نمازِ جنازہ کے لیے لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے ہوں گے اور نمازِ جنازہ پڑھ کر دوسرے دروازے سے باہر نکلتے جاتے ہوں گے۔

حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر نبی کو اُسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو۔''

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہٹا کر وہیں قبر کی کھدائی شروع کی گئی۔ ①

منگل اور بدھ کی درمیانی شب اُمہات المؤمنین اپنے حجروں میں سخت زمین پر کدالیں چلنے کی آواز سن رہی تھیں۔ ②

قبر تیار ہوچکی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام شقران رضی اللہ عنہ نے جلدی سے ایک سرخ چادر قبر کے اندر بچھادی، حضرت علی، حضرت عباس اور ان کے لڑکے قثم بن عباس رضی اللہ عنہم نے قبر میں داخل ہو کر جسد اطہر کو اندر اُتارا۔ ③

سب سے آخر میں حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ مرقد میں اُترے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کو درست کیا، اس کے بعد مرقد پر مٹی ڈال دی گئی۔ ④ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مشک لے کر قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ ⑤

یوں حرا کا چاند طیبہ کی خاک میں روپوش ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازوں سے پورا مدینہ گونج اُٹھا۔ زمین و آسمان نے اس سے زیادہ سوگوار اور دردناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ⑥

پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں کے لیے یہ احساس ناقابل برداشت تھا کہ اب اس دنیا میں مشتاق نگاہیں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کبھی نہ کرسکیں گی۔ صحابہ کرام نے باقی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح صادق کے وقت حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ حسبِ معمول اذان دینے لگے۔ '' اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہ '' پر پہنچے تو ضبط کی تاب نہ رہی۔ زاروقطار رونے لگے۔ ⑦

نمازِ جنازہ اور تدفین میں تاخیر کیوں ہوئی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پیر کی سہ پہر ہوئی تھی اور نمازِ جنازہ اگلے روز منگل کو ظہر کے بعد۔ پھر تدفین منگل اور بدھ کی درمیانی شب ہوئی۔ ان امور میں تاخیر کا ایک سبب تو صحابہ کرام اور اہلِ بیت کا رنج وغم سے نڈھال ہونا تھا۔ دوسرا بڑا سبب امرِ خلافت کو طے کرنا تھا۔ نمازِ جنازہ اور تدفین کے امور اس کے بعد ہی انجام پذیر ہوئے۔

اس اہم کام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ جنازہ اور تدفین سے بھی پہلے انجام پا جانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ جنازے میں تاخیر ہونے سے یہ امکان تو ہرگز نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر میں کوئی تغیر پیدا ہو جائے گا؛ کیوں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اجسام وفات کے بعد بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ہاں اگر خلیفہ کا انتخاب فوراً نہ ہوتا تو کئی مسئلے کھڑے ہو جاتے۔

---

① دلائل النبوة للبیهقي: ۲۶۰/۷

② دلائل النبوة للبیهقي: ۲۵۲/۷، ط العلمیة

③ البدایة والنهایة: ۱۴۴/۸، دار هجر

④ مسند احمد، ح: ۲۰۷۶۶

⑤ دلائل النبوة للبیهقي: ۲۶۴/۷

⑥ دلائل النبوة للبیهقي: ۲۶۷/۷

⑦ دلائل النبوة للبیهقي: ۲۶۷/۷

تجہیز و تکفین سے قبل خلافت کے مسئلے کو حل کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا؟

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی، اگر اس عظیم کام کو کسی قائد کی نگرانی کے بغیر انجام دیا جانے لگتا تو بات بات پر اختلافات رونما ہوتے۔ اوّل تو یہی بات تنازعے کا باعث بن جاتی کہ نمازِ جنازہ کہاں ادا کی جائے؟ لوگ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو رہے تھے، اس لیے کھلے میدان میں نمازِ جنازہ ادا کرنا چاہتے، بہت سے لوگ دیدارِ عام کی تمنا بھی کرتے، ایسے میں آخری نگاہیں ڈالتے ہوئے ہزاروں لوگوں کا غم کی انتہا سے حواس کھو بیٹھنا بالکل بعید نہ تھا۔ اس بات پر بھی اختلاف ہوتا کہ نمازِ جنازہ کون پڑھائے؟ تدفین کہاں ہو؟ جب پہلے قیادت کا مسئلہ طے ہو گیا تو پھر ہر کام ایک امیر کے اختیار کے ساتھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا۔

امرِ خلافت کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسلام کے آغاز سے اب تک مسلمانوں پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا تھا کہ وہ کسی امیر کے بغیر ہوں، حضور ﷺ ہی سب کے امام، رہنما اور امیر تھے جن کے تحت مسلمان متحد و متفق تھے۔ اب کسی امیر یا خلیفہ سے تھوڑی دیر کی محرومی بھی مسلمانوں کے لیے نہایت گراں تھی اور اُمّت کے اکابر خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر یہ صورتحال زیادہ دیر رہی تو کہیں اُمّتِ مُسلِمہ کسی افتراق و انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ شرپسند عناصر جو منافقین کی شکل میں دورِ نبوت میں بھی سرگرم رہے کوئی بات اُڑا کر اس مسئلے کو اختلاف بلکہ خانہ جنگی کی شکل دے سکتے تھے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں کئی بار وہ ایسی مذموم کوششیں کر چکے تھے۔ ان وجوہ سے صحابہ کرام کے پاکیزہ اذہان اور دوراندیش دماغوں کی رَو خود بخود اس طرف ہو گئی کہ سب سے پہلے حضورِ اقدس ﷺ کے جانشین کا مسئلہ طے کر لیا جائے۔ وہ لوگ ظاہر بین بلکہ کوڑھ مغز ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کو حضور ﷺ کی محبت سے زیادہ اقتدار کی فکر تھی، اس لیے وہ تجہیز و تکفین کی بجائے خلافت کے استحقاق پر بحث کرنے لگے۔ حقیقت یہ تھی کہ انہیں پیغمبر ﷺ کی محبت ہی کی وجہ سے پیغمبر کے دین کو بچانے کی فکر لاحق تھی اور اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ فی الفور خلافت کا منصب کسی ذمہ دار ترین شخص کو سونپ کر اُمّتِ مُسلِمہ کو متحد اور یکجا رکھا جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رنج و غم:

حضور ﷺ کی رحلت کے سانحے نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جس کرب و غم میں مبتلا کیا تھا اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جسے آقائے نامدار ﷺ کی محبت کا درد نصیب ہوا ہو۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آئے تو حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا فرما رہی تھیں:

"انس! تم نے کیسے گوارا کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ کو دفنا کے مٹی ڈال کر واپس چلے آئے۔"[1]

بچپن سے بڑھاپے تک حضورِ اکرم ﷺ کی غم گسار و سرپرست حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا روتے ہوئے فرما رہی

---

[1] سنن ابن ماجۃ، ح: ۱۳۲۱

تھیں: ''ہم نزولِ وحی کی برکت سے محروم ہو گئے۔'' (1)

حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو چند ماہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے شہر ''صنعاء'' بھیجا تھا، جہاں وہ لوگوں کو دین سکھانے اور شریعت کے مطابق اُن کے مابین فیصلے کرنے کی ذمہ داری انجام دے رہے تھے۔ اس رات وہ اپنے بستر پر سو رہے تھے کہ کسی نے پکارا ''مُعاذ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور تم زندگی کے مزے لے رہے ہو۔''

وہ اس طرح ہڑ بڑا کر اُٹھے جیسے قیامت کا صور پھونک دیا گیا ہو۔ دوڑتے ہوئے صنعاء کی گلیوں میں آئے اور چلائے: ''یمن والو! مجھے جانے دو۔ کیا المناک دن تھا جب میں اپنے آقا کے قدموں کو چھوڑ کر یہاں آن بسا۔''

لوگ پوچھتے رہے کہ کیا ہوا؟ مگر وہ کچھ کہے سنے بغیر اپنی سواری کو ایڑی لگا کر سرپٹ مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ مدینہ سے تقریباً پچاس میل (۸۰ کلومیٹر) دور تھے کہ سامنے سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر لے کر یمن جا رہے تھے۔ حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو پہچان کر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکا اور سانحے کی اطلاع دی۔ وہ بولے:

''عمار! اب رہنمائی کس سے لیں گے اور فریاد کس کو سنایا کریں گے؟''

اسی حالت میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے تک پہنچے۔ دستک دے کر اپنا تعارف کرایا اور تعزیت کی۔ وہ بولیں: ''مُعاذ! اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت دیکھ لیتے تو دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی طویل ہوتی، کبھی اچھی معلوم نہ ہوتی۔''

یہ سن کر حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ اتنا روئے کہ غشی طاری ہوگئی۔ (2)

یَا خَیْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُہٗ ۔۔۔ فَطَابَ مِنْ طِیْبِھِنَّ الْقَاعُ وَالْاَکَمُ

نَفْسِی الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاکِنُہٗ ۔۔۔ فِیْہِ الْعَفَافُ وَفِیْہِ الْجُوْدُ وَالْکَرَمُ

''اے وہ سب سے پاکیزہ ہستی جس کی استخواں زیرِ خاک دفن ہیں
پس ان کی خوشبو سے یہ زمین بھی مہک اٹھی اور یہ برگ وبار بھی
میری جان اس مرقد پر قربان جس میں آپ تشریف فرما ہیں
شرافت، سخاوت اور جود وکرم کی ساری صفات یہیں جمع ہیں۔

(1) مسند احمد، ح: ۱۳۲۱۵
(2) سیرت ابن حبان: ۲/ ۴۲۷، ۴۲۸